محمد حنیف ندوی

غزالی کی مشہور کتاب
المنقذ من الضلال
کی تلخیص

غزالی کی سرگزشت انقلاب

(۵)

معجزہ کب دلیل ہوسکتا ہے؟ اس کی پیچیدگیاں

دوم یہ کہ یہ صحیح ہے کہ آپ رفع نزاع کے مدعی ہیں۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ وہ حیران و ششدر شخص جس کو مذاہبِ مختلفہ اور گوناگوں آراء نے چکر میں ڈال رکھا ہے تسکینِ قلب کے لئے آپ ہی کے پاس آئے اور آپ کے مخالف کے پاس نہ جائے۔ جبکہ انکی تعداد کافی ہے۔ اور آپ میں اور ان میں بظاہر کوئی فرق بھی نہیں۔

میرا جواب یہ ہے کہ یہی سوال آپ سے بھی ہوسکتا ہے۔ جب آپ ایسے ڈانواڈول صاحب کو دعوت دینگے۔ تو یہ کہہ سکیں گے کہ جناب آپ اپنے مخالفین سے کس بات میں بہتر ہیں۔ آپ کی طرف رجحان ہو تو کیوں؟

ہم نہیں جانتے کہ آپ کا جواب کیا ہوگا! کیا آپ یہ کہیں گے کہ میں جس امام کو مانتا ہوں اسکے حق میں نص صریح آئی ہے لیکن وہ اس نص صریح کو کیوں ماننے لگا۔ جبکہ اس نے اس کو براہ راست آنحضرتؐ سے سُنا ہی نہیں۔ ہاں اس نے یہ بات البتہ ان سے سُنی ہے کہ آپ اس دعویٰ میں جھوٹے اور مخترع ہیں۔

فرض کیجئے، وہ اس نص صریح کو بھی تسلیم کرلیتا ہے۔ تب بھی کیا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نفس نبوت ہی کا منکر ہو۔ اس پر ممکن ہے آپ یہ موقف اختیار کریں۔ کہ ہمارا امام اپنی حقانیت پر وہی معجزے دکھا سکتا ہے، جو حضرت مسیح نے دکھائے، تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ انھوں نے اس شخص کے مردہ باپ کو زندہ بھی کردیا اور اس نے انکی سچائی پر مہر تصدیق بھی ثبت کردی۔ تو بھی وہ کہہ سکتا ہے۔ کہ جناب جب حضرت مسیحؑ کے مخالفین کو اس انداز کے خوارق مطمئن نہیں کرسکے تو میں کیوں کر مطمئن ہوسکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ان خوارق و معجزات کے بارہ میں بہت سی باریک اور پیچیدہ عقلی بحثیں ہیں جن سے بجز فکر و استدلال کی استواریوں کے عہدہ برا ہونا آسان نہیں اور آپ ہیں کہ فکر و استدلال کی دقیقہ سنجیوں کے سرے سے قائل ہی نہیں!

معجزہ بلاشبہ حق و صداقت کی دلیل ہے مگر اس وقت جب سحر کی حقیقت واضح کردی جائے، اور یہ بتا دیا جائے کہ ان دونوں میں حدود فارقہ کیا ہیں؟ اور یہی مشکل ہے، معجزات سے نبوت پر اسی صورت میں استدلال کیا جاسکتا ہے جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو گمراہی کی آزمائشوں میں نہیں ڈالتا۔ لیکن کیا یہ ثابت کرنا آسان ہے؟ اگر آسان نہیں ہے، جیسا کہ ظاہر ہے تو آپ ان ایرادات کا کیا جواب دینگے۔ آپ کے امام کی اطاعت کو اولیٰ کیونکر ثابت کیا جاسکے گا۔ اس صورت میں دلائل عقلیہ کو استعمال میں لانے اور برتنے کے سوا چارہ نہیں۔ جن کے آپ منکر ہیں۔ پھر اگر آپ نے

دلائل عقلیہ سے تعرض کرنا منظور بھی کر لیا تو اس امکان کا کیا علاج آپ کے پاس ہے کہ آپ کے خصم کا پلڑا از روئے دلائل زیادہ بھاری ہو۔ غرض یہ ایسا چکر ہے، کہ اگر ان کے اوائل اور متاخرین سب مل کر بھی اس سے نکلنا چاہیں تو نہ نکل سکیں۔

دراصل اس سلسلہ میں قباحت یہ ہوئی کہ ہمارے کمزور قسم کے مناظرین نے انکے اس سوال کو انھیں پر پلٹا نہیں بلکہ ایسے طویل طویل جوابات دینا شروع کیے، جو نہ تو آسانی سے سمجھ میں آنے والے تھے اور نہ ایسے تھے کہ خصم ان پر سکوت اختیار کر لیتا

پہلے بیماری متعین کیجئے، اگر کوئی شخص میرے اس طریق بحث پر یہ اعتراض کرے۔ کہ جناب! آپ نے کیا کمال کیا۔ یہ تو محض الٹ پھیر کا چکر ہوا۔ جس سے نہ خصم نکلا، اور نہ آپ نکل سکے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا کوئی شافی اور تحقیقی جواب بھی ہے؟ پھر علاج پر غور ہو گا

میں کہونگا کہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص حیرت و شک میں گرفتار ہے ہم اُس سے مطالبہ کرینگے، کہ پہلے وہ اس مسئلہ کی تعیین کرے جس میں کہ اسے تحیر حاصل ہوا ہے۔ مطلقاً تحیر و شک قابل علاج نہیں۔ ایسا شخص جو مسئلہ کی تعیین نہیں کرتا اور جواب چاہتا ہے، ایسے مریض کی طرح ہے جو دوا کا خواہاں تو ہے مگر یہ نہیں بتا پاتا کہ اسے تکلیف کیا ہے، ایسے مریض سے قدرتاً یہی کہا جائیگا کہ متعین بیماری جیسے درد سر اور اسہال وغیرہ کا علاج تو ممکن ہے۔ مگر غیر متعین اور مطلق بیماری کا علاج کسی طبیب کے پاس نہیں۔ اگر وہ تحیر و شک کے مقامات کی تعیین کریگا، تو میں اُسے حق و باطل کی تمیز انہیں پانچ اُصولوں سے کر کے دکھاؤں گا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص پکار اُٹھے گا، کہ یقیناً حق و باطل کو جانچنے کی یہی صحیح کسوٹی ہے اور یہ اس بات کی تصدیق کریگی۔ کہ ادلہ کا وزن کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ترازو نہیں ہو سکتی، نیز ہر شخص کو ترازو اور تول کی صحت پر اسی طرح یقین آ جائیگا جس طرح حساب کے طالب علم کو فن حساب اور معلم حساب کی صداقت پر یقین آ جاتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "القسطاس المستقیم" میں ان پانچ اُصولوں کو اچھی طرح بیان کر دیا ہے۔ جسے دیکھنا ہو اس کتاب میں دیکھ لے۔

یہاں مقصود یہ نہیں کہ ان کے مذہب کی رکاکت واضح کی جائے۔ اس سے تو مدت ہوئی میں فارغ ہو چکا۔ چنانچہ اس غرض کیلئے میری کتاب "المستظہری" دیکھئے۔ "حجۃ الحق" دیکھئے جو ان اعتراضات کے جواب میں ہے۔ جو میرے افکار پر بغداد میں کئے گئے "مفصل الخلاف" ملاحظہ ہو۔ جو تقریباً بارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ان سوالات کا جواب ہے جو میرے سامنے ہمدان میں پیش کئے گئے۔ اسی طرح "الدرج" ملاحظہ ہو جس میں با قاعدہ نقشہ اور جداول مرقوم ہیں۔ اور "القسطاس المستقیم" دیکھنے کی چیز ہے جس میں اس حقیقت کی اچھی طرح تشریح کی گئی ہے، کہ علوم کی جانچ پرکھ کے لئے کون کسوٹی صحیح ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ امام معصوم کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

مقصود یہ بتانا ہے کہ تعلیمیہ کے پاس اختلاف رائے کی تاریکیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ بلکہ منصب امامت پر بھی کوئی عقلی دلیل ان کے ہاں نہیں ملتی۔

تعلیمیہ کے پاس نصب امامت پر کوئی عقلی دلیل نہیں۔ فیثاغورس کے رکیک فلسفہ کا تتبع

مدت ہوئی میں نے ان سے مقابلہ کیا، اور میں نے انہیں بتا دیا، کہ بلاشبہ تعلیم کی ضرورت ہے اور معصوم معلم کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ میں نے بر سبیل تنزل یہ بھی مان لیا کہ میں تمہارے تعیین کردہ امام ہی کو معصوم مانتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم نے ان سے کیا سیکھا اور کن معارف کی تعلیم حاصل کی۔ میں نے اس

سلسلہ میں جو اشکالات پیش کیے، ان کا جواب دینا تو درکنار یہ ان کو سمجھ بھی نہ سکے۔ آخر عاجز ہو کر امام غائب پر ان اعتراضات کو اٹھا رکھا، اور کہا کہ ان کی خدمت میں پہنچ کر ان کا جواب حاصل کرنا چاہیئے۔ تعجب ہے کہ انھوں نے ساری عمر تو ایسے معلم معصوم کی تلاش میں ضائع کی، پھر بزعم خود اس کو پا بھی لیا، اور اس پر مسرت و ابتہاج کا اظہار بھی کیا۔ لیکن بے کار۔ اس سے کچھ سیکھ بھی نہ پائے۔ اور دامنِ طلب جیسے پہلے خالی تھا اس کے بعد بھی خالی ہی رہا۔ انکی حالت اس نجاست سے لتھڑے ہوئے بدنصیب شخص کی سی ہے، جو پانی کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ پھر جب پانی مل جائے تو اس کو ازالہ نجاست کیلئے استعمال نہ کرے۔

تعلیمیہ میں سے بعض لوگوں نے امام معصوم سے استفادہ کا دعوی کیا ہے لیکن وہ جن مسائل کا دعوی کرتے ہیں وہ فیثاغورث[1] کا رکیک فلسفہ ہے ارسطاطالیس نے اس کی تردید کی ہے اور اسے ضعیف ترین فلسفہ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ رسالہ اخوان الصفاء میں مذکور ہے۔ لہٰذا اس کو فلسفہ کہنا ہی غلط ہے، یہ تو محض بھرتی کی چیز ہے[2]۔

حیرت ہے کہ ایک شخص اپنی عمر تحصیل علم میں کھپائے، اور پھر اس ڈھنگ کی رکیک اور بودی باتوں پر بھروسہ کر بیٹھے۔ اور اپنے دل میں یہ سمجھے، کہ گویا علوم کی غرض و غایت کو پا لیا ہے۔

یہ ہیں وہ تعلیمیہ جنہیں میں نے اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھا ہے اور جن کے ظاہر و باطن پر گہری نظر ڈالی ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ لوگ عوام کو یہ کہہ کر پھانسنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کہ انکو دین کی مشکلات کو سلجھانے کیلئے ایک امام معصوم کی احتیاج ہے۔ یہ کمزور عقل کے لوگ جب اس کا انکار کرتے ہیں۔ تو یہ قوی دلائل سے اسکی احتیاج ثابت کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہہ دے۔ کہ اچھا میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ایک معصوم معلم کی احتیاج ہے۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ نے اس معلم سے کیا سیکھا اور کیا حاصل کیا آخر کچھ مجھے بھی تو بتائیے تو اس پر یہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ تم نے تعلیم اور معلم کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تو یہی بہت ہے۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اس تعلیم کو حاصل کرنے کے درپے رہو، ہمارا کام بس اتنا ہی تھا۔

اس سے زیادہ وہ اس لئے نہیں بتاتے کہ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ اگر کچھ کہا تو رسوائی ہوگی کیونکہ اس سلسلہ میں ادنی اشکالات کا جواب دینے پر بھی یہ قادر نہیں۔ اور جواب دینا تو الگ رہا ان اشکالات کو سمجھ لینا بھی ان کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ہے ان کی حقیقت حال۔ تم جس قدر ان کو ٹٹولو اور پرکھو، پرکھو گے اسی نسبت سے ان سے نفرت کرنے لگو گے۔ میں نے جب انکو

---

[1] فیثاغورس یونانی حکما میں اونچے درجے کے فلسفی ہیں۔ ارسطو نے اپنے مضامین میں اس کا نام لیکر خصوصی تذکرہ نہیں کیا نہ اس پر کوئی تنقید ہی کی ہے، البتہ اس نے بحث و فکر کے دائرہ کو چونکہ تمام فیثاغورثی عقائد تک پھیلایا ہے اسلئے ضمناً اسمیں فیثاغورس کی تردید کا پہلو بھی نکل سکتا ہے۔ ریاضی اور فلکیات پر اسکے لائق اعتناء احسانات ہیں، اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ کائنات ریاضیاتی حقائق سے تعبیر ہے، غزالی نے اسکے خیالات کی رکاکت کا جو ذکر کیا ہے اس کا تعلق اس کے بنیادی افکار سے نہیں، بلکہ ان خیالات سے ہے۔ جو روح اور اس کی تجسیم و تناسخ کے بارہ میں ہیں لیکن ان خیالات کو صرف فیثاغورس کے خیالات قرار دینا صحیح نہیں اس عہد کے اکثر بڑے بڑے حکما انہیں تصورات کے حامی تھے۔

فیثاغورس کا عہد پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کے درمیان کا ہے۔

آدمایا اور پرکھا تو کوئی توقع نہیں رہی۔ اس لئے ان سے اپنا ہاتھ اٹھالیا۔

صوفیاء کا طریق حق

تصوف علم وعمل کی راہ ہے صرف علم کی نہیں سکر و مستی کو جاننا اور شے ہے اور سکر و مستی سے دوچار ہونا شئے دیگر

میں جب ان تمام علوم کی تحقیق و تفحص سے فراغت پا چکا تو پوری توجہ سے صوفیاء کے طریقِ حق کی طرف مائل ہوا، میں نے دیکھا کہ انکی راہ صرف علم و فن کی راہ نہیں۔ بلکہ علم اور عمل دونوں کی راہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے، کہ نفس کی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کیا جائے، اخلاقِ ذمیمہ کو ترک کرکے دل کو اس لائق ٹھہرایا جائے، کہ اس میں غیر اللہ کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہ رہے۔ اور اللہ کے ذکر اور یاد کے ساتھ اس کی آبادی اور زینت کا اہتمام کیا جائے۔

چونکہ اس سے متعلقہ علم میرے لئے عمل سے سہل تر تھا۔ اس لئے قدرتاً پہلے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا جن میں تصوف کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ جیسے ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور الحارث المحاسبی کے مولفات۔ ان کے علاوہ ان اقوال کے مطالعہ کا موقع بھی ملا، جو جنید، شبلی، اور ابو یزید البسطامی اور ان کے مشائخ کی طرف منسوب ہیں۔ اس سے مجھے انکے بارہ میں اتنا علم حاصل ہو گیا جتنا کہ تحصیل وسماع سے ممکن ہے۔ مگر ان کے لطائف اور خصوصی اسرار کا احاطہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان تعلیم و تعلم کی حدوں سے گزر کر ذوق و حال کی سرمستیوں سے واقف نہ ہو۔ اور اپنے اندر صفات و اخلاق کی تبدیلیاں نہ پیدا کرے۔ بھلا یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک آدمی جب صحت و تندرستی کی کنہ علمی کو پالے تو صحت و قوت کے فوائد سے بھی بہرہ مند ہو جائے یا شکم سیری کی علمی تعریف معلوم کرلے تو اس سے اسکے پیٹ کے قلابے پر ہو جائیں۔ سکر و سرمستی کو جاننا اور چیز ہے اور سکر و سرمستی سے دوچار ہونا شئے دیگر۔ کتنے ہی طبیب و معالج ایسے ہیں کہ بیماری کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ اسباب و علائم مرض کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اور دوا و نسخہ کا بھی پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ مگر خود اپنی صحت کے معاملہ میں کچھ زیادہ خوش قسمت نہیں! پھر جس طرح ان دونوں حقیقتوں میں فرق ہے اسی طرح زہد و ورع کی کیفیتوں کو جان لینے اور انکو اپنے اندر پیدا کرنے میں فرق ہے۔

میں نے جب اس فرق کو محسوس کیا تو ان لوگوں کی صحبت میں رہنا شروع کیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ حضرات اصحاب اقوال نہیں اصحاب احوال ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں تک سماع و تعلیم کے فوائد کا تعلق ہے ان سے میں نے اپنا دامن بھر لیا لیکن ابھی اس علم کو حاصل کرنا باقی ہے۔ جو محض ذوق و سلوک سے حاصل ہوتا ہے۔

اس سے پہلے میں جن شرعی و عقلی علوم کو آزما چکا تھا اور دین و فکر کے جن راستوں پر چل چکا تھا۔ اس سے اتنا معلوم ہو ہی چکا تھا، کہ تین باتوں کا ماننا بہر حال ضروری ہے:

(۱) اللہ پر محکم ایمان۔

(۲) نبوت کی قلبی تصدیق۔ اور

(۳) روزِ آخرت۔

تقویٰ کی حقیقت اور احتساب نفس ایمان کی یہ تین بنیادیں۔ دل میں نقش ہو چکی تھیں، لیکن کسی ایک ہی اور معین دلیل کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے متعدد اسباب تھے، اور مختلف قرائن اور تجربے تھے، انکی تفصیل تحریر میں نہیں آسکتی۔ اب یہ راز منکشف ہوا، کہ عالم آخرت کی بہرہ مندیاں بجز تقویٰ کے اور نفس کو خواہشات سے بچانے کے حاصل نہیں ہو سکتیں لیکن یہ تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ اس سے تعبیر ہے کہ قلب علائق دُنیا سے دستبردار ہو جائے۔ اور انسان اس دار الغرور سے منہ موڑ کر دار الخلود کی طرف رُخ کرے۔ یہی نہیں بلکہ پوری توجہ و ہمت سے اللہ کی طرف عنان التفات پھیر لے۔ مگر یہ مقام آسانی سے میسر ہونے والا نہیں۔ اس کے لیے عزت و جاہ کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ مال و دولت سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے۔ اور ہر طرح کے لگاؤ اور شغل سے دل کو ہٹانا ہوتا ہے۔

میں نے اس نقطہ نظر سے جب اپنے احوال کا جائزہ لیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ علائق میں بُری طرح گرفتار ہوں، اعمال پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ انمیں، تدریس و تعلیم کا مشغلہ جو نسبتہً بہتر ہے وہ بھی کچھ لائق قدر نہیں، کیونکہ جن علوم کا میں درس دے رہا ہوں، وہ آخرت و عقبیٰ میں کام آنے والے نہیں۔

پھر جب نیتوں کو ٹٹولا، تو یہاں بھی بگاڑ نظر آیا۔ یوں محسوس ہوا، کہ اس مشغلہ سے مقصود اللہ کی رضا جوئی نہیں ہے، بلکہ اس کا محرک جاہ طلبی کا جذبہ ہے اور شہرت و نام آوری کا داعیہ ہے۔ اس صورتِ حال سے دوچار ہونا تھا کہ آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ جہنم کے کنارے پر ہوں اور اگر تلافیِ احوال کی کوئی کوشش بروئے کار نہ لائی گئی، تو اس میں گر جانا یقینی ہے۔

کشاکش: اس تجزیۂ احوال کا خیال آنا تھا، کہ فکر دامنگیر ہوئی اور ایک عرصہ تک حیص بیص کے عالم میں رہا۔ زمام اختیار اگرچہ اب تک میرے ہاتھ میں تھی تاہم قوت فیصلہ کھو چکا تھا۔ کبھی یہ سوچتا کہ بغداد سے نکل جاؤں اور جاہ و ثروت کے ان احوال سے دست کش ہو جاؤں۔ کبھی موانع آگھیرتے، ایک قدم آگے بڑھاتا تو دُوسرا پیچھے کو ہٹاتا۔ اگر کسی صبح کو عقبیٰ کی طلب صادق دل میں کروٹ لیتی، تو شام کو جنودِ شہوت ہلّہ بول دیتے، نتیجہ یہ ہوتا کہ ہمتیں پست ہو جاتیں۔ ایک طرف دُنیا کی خواہشات بغداد ہی میں رہ جانے پر مجبور کرتیں اور دُوسری طرف داعیۂ آخرت کوچ! کوچ!! پکارتا۔ اور کہتا، کہ عمر بہت کم رہ گئی ہے۔ سفر جو درپیش ہے طولانی ہے۔ اور علم و عمل کی جس پونجی پر تمھیں ناز ہے، وہ ریا و تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اسلئے اب اگر آخرت کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس وقت علائق دُنیا سے پیچھا نہیں چھڑاتا تو اس کا موقع کب پیدا ہوگا۔ جب ایسے خیالات سطح دل پر اُبھرتے تو دل چاہتا کہ بغداد سے نکل بھاگوں۔ لیکن پھر فوراً ہی شیطان پلٹ کر دل میں ڈالتا۔ کہ یہ کیفیتیں تو سراسر عارضی ہیں۔ انکی اطاعت ہرگز اختیار نہ کرنا کیونکہ اس وقت تو یہ جاہ و رتبہ تمھیں بغیر کسی تکدر کے حاصل ہے، اور اس میں تمہارا کوئی شریک اور خصم بھی نہیں۔ لیکن اگر ان کیفیتوں سے متاثر ہو کر تم نے اس کو چھوڑ دیا۔ تو اس کے بعد تمہارا دل پھر اس ٹھاٹھ پر للچائیگا۔ اور اس وقت اسکے حصول کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

امدادِ غیبی سے زبان بند ہوگئی: اس تردد اور بے یقینی کی حالت میں کوئی چھ ماہ تک پڑا رہا۔ کبھی خواہشات دُنیا روکتیں اور کبھی دواعی آخرت، ضرب و فرار پر اکساتیں۔ آخر غیب سے سامانِ معاونت پیدا ہوا، اور میں نے حدِ اختیار سے نکل کر اضطرار کی سرحد

میں قدم رکھا یعنی یکایک میری زبان بند ہوگئی، اور میں نے مجبوراً درس و تعلیم کے مشغلوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب یہ حالت تھی کہ طالب علم میرے پاس آتے تھے، اور میں چاہتا بھی تھا کہ ان کو پڑھا کر ان کا دل خوش کروں، مگر زبان بالکل چلتی نہ تھی۔ اس پر دل بدرجہ غایت غمگین ہوا۔ کھانا پینا یکسر چھوٹ گیا۔ قوت ہضم نے جواب دیدیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ نہ کھانے کی کوئی چیز بھاتی تھی، اور نہ پانی کا ایک گھونٹ پیا جا سکتا تھا۔ نقاہت تھی کہ تمام قویٰ میں جاری و ساری! اطبا نے تھک ہار کر علاج سے ہاتھ اٹھایا اور کہا "کہ یہ کوئی جسمانی عارضہ نہیں بلکہ اس کے دل پر پہلے کوئی صدمہ پہنچا ہے اور پھر اس نے مزاج کی طرف رخ کر لیا ہے۔ اب جب تک اس صدمہ کا علاج نہ ہو، اور دل کو راحت میسر نہ آ لے، دوسرے علائم کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس اضطرار کے ہاتھوں قطعی عاجز ہو گیا ہوں اور میرا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ اس مرحلہ پر میں نے ایک عاجز و بے بس انسان کی طرح اس ذات گرامی کی طرف دعا کا ہاتھ بڑھایا۔ جس کی تعریف ہی یہ ہے کہ:

یجیب المضطر اذا دعاہ $\frac{\text{النمل}}{62}$ وہ بے بسوں کی دعائیں سنتا ہے۔

اس سے جاہ و مال اور عیال و اولاد سے علیحدگی اختیار کر لینا آسان ہو گیا۔ چنانچہ سفر کی ٹھانی، لوگوں کو یقین دلایا کہ مکہ معظمہ کا ارادہ ہے۔ حالانکہ ارادہ یہ تھا کہ شام کو مستقر ٹھہراؤں اور واپسی کا نام نہ لوں۔ یہ تدبیر اس لئے اختیار کی کہ مبادا خلیفہ اور میرا حلقہ احباب اس فیصلہ پر مطلع نہ ہو جائیں اور مجھے روک نہ دیں۔ علماء عراق میرے اس عزم و ارادہ کے مخالف تھے اسی لئے انھوں نے اس پر ملامت بھی کی کہ اس شان و شکوہ سے کیوں دستبردار ہو رہا ہوں۔ ان کے نزدیک یہ منصب تعلیم اور مسند درس جس پر کہ میں فائز تھا ایسی نہ تھی کہ اس کو چھوڑ دینا دینی خدمت سمجھا جاتا، کیونکہ وہ تو اسی کو بہت بڑا دینی اعزاز قرار دیتے تھے۔ یہ تھا ان کا مبلغ علم۔

قیاس آرائیاں: میری اس روش نے عوام کو عجیب عجیب قیاس آرائیوں میں ڈال دیا۔ جو لوگ عراق سے دور تھے وہ تو میری اس حرکت کو حکام کے ایماء پر محمول کرتے تھے اور جو حکام سے قریب تر تھے وہ جب دیکھتے کہ حکام کس قدر میری طرف ملتفت ہیں۔ اور میں کتنا ان سے بدکتا اور دور رہتا ہوں، تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "یہ کوئی آسمانی تدبیر ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا، کہ اہل اسلام اور گروہ علماء کو نظر بد لگ گئی ہے"۔

پھر آئندہ میں نے بغداد چھوڑ دیا۔ اور جسقدر مال و دولت میرے پاس تھا اس میں سے بقدر کفالت بچوں کے لئے رکھ کر باقی سب اللہ کی راہ میں دیدیا اور جو رکھ لیا تو وہ اس بنا پر کہ عراق کا مال مسلمانوں کے مصالح کے لئے وقف ہے۔ اس لئے میرے بچوں کے لئے اس سے زیادہ نافع مال اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

بغداد کو چھوڑنے کے بعد میں نے شام کا رخ کیا۔ اور قریباً دو سال تک یہاں رہنا پڑا، ان دو سالوں میں عزلت و خلوت، اور مجاہدہ و ریاضت شب و روز کا مشغلہ تھا۔ غرض یہ تھی کہ تزکیہ نفس کی نعمت پاؤں۔ اخلاق سنواریں اور قلب اللہ کی یاد کے لئے یکسوئی حاصل کرے۔ یہ لائحہ عمل وہی تھا جس کو میں نے صوفیاء سے سیکھا تھا۔ میرا یہ روزانہ کا معمول ہو گیا تھا کہ دمشق کی ایک مسجد کے منارہ پر چڑھ جاتا اور دروازہ بند کر کے ذکر و شغل میں دن بھر لگا رہتا۔ پھر یہاں سے بیت المقدس کو

منتقل ہوگیا اور مقام ہجرہ میں ہر روز جا کر عبادت میں مصروف رہنے لگا۔

پھر فریضہ حج کے داعیہ نے کروٹ لی، اور دل چاہا کہ مکہ و مدینہ کے فیوض و برکات سے بہرہ مندی حاصل کی جائے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاں حاضری دینے کے بعد رسول اللہ کی زیارت کا شوق حاصل کیا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا، کہ حجاز کا قصد کیا۔

وطن کی یاد: حج سے فراغت ہوئی، تو بال بچوں کی کشش نے کھینچا۔ اور وطن کی یاد دلائی۔ میں اگرچہ ان علائق سے دُور ہو چکا تھا۔ تاہم وطن میں آنا ہی پڑا۔ یہاں پر بھی عزلت گزینی کا شوق قائم رہا۔ چنانچہ مجبوریوں کے باوجود تصفیہ قلب کی خاطر خلوت و علیحدگی کا انتظام کرتا رہا۔ اور جس طرح بھی بن پڑا، ذکر و فکر اور خلوت و عزلت کے لمحوں سے استفادہ کرنے میں کوتاہی نہ ہونے دی۔ اگرچہ اس اثناء میں حوادث زمانہ، بال بچوں کی ضروریات اور معاش کی مصروفیتیں مخل انداز ہوتی رہیں اور یہ چیزیں بار بار خلوت کی مسرتوں کو مکدر کرتے رہے۔ لیکن بایں ہمہ خلوت کی مسرتوں کی طرف میں رجوع کرتا ہی رہا۔

اس کشاکش اور خلوت و مراقبہ پر دس سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں ایسے ایسے امور کا انکشاف ہوا کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ اس مرحلہ پر صرف اسی قدر بتاؤں گا کہ جس کا جاننا نفعمند اور مفید ہے۔

مجھے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوا، کہ صوفیا ہی کا وہ گروہ ہے جو خصوصیت سے اللہ کی راہ پر گامزن ہے، انہیں کی سیرت سب سے بہتر ہے، انہیں کا طریقہ زیادہ صاف ہے اور انہیں کے اخلاق زیادہ پاکیزہ اور بلند ہیں، بلکہ اگر تمام عقلاء و حکماء کی عقل و حکمت کو جمع کر لیا جائے اور واقفانِ شریعت کے اسرار و علم کو ملا لیا جائے، تاکہ ان سے بہتر سیرت کی تشکیل ہوسکے، تب بھی ان کے اخلاق و سیرت کے ڈھانچے کو بدلنا ضروری نہ ہو۔ کیونکہ صوفیاء کی تمام حرکات و سکنات، چاہے ظاہری ہوں چاہے باطنی مشکوٰۃ نبوت ہی سے مستنیر ہیں، اور نور نبوت سے بڑھ کر کوئی نور رُوئے زمین پر اس لائق نہیں کہ اس سے روشنی حاصل کی جائے۔ مقصود یہ ہے، کہ ایسے طریق کی بلندی و صحت پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ جس میں پہلی شرط ہی دل کو ماسوائے اللہ سے پاک کرنا ہے اور جس کی تکبیر تحریمہ ہی یہ ہے کہ دل کو اللہ کے ذکر میں مستغرق رکھا جائے۔ جس کا آغاز یہ ہو، اور انتہا یہ ہو کہ سالک اللہ کی ذات میں اپنے کو کلیتہً فنا کر ڈالے۔

فنا فی اللہ سلوک کا پہلا زینہ ہے: فنا فی اللہ کا یہ درجہ آخری، کسب و اختیار کی رعایت سے ہے ورنہ سلوک کا تو یہ پہلا زینہ ہے اور اس سے پہلے جو کچھ ہے، اس کو اس کی دہلیز سمجھئے۔ کیونکہ یہاں تو پہلے مرحلہ ہی پر مکاشفات و مشاہدات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ صوفیاء جب اس مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں، تو عالم بیداری میں پہلے فرشتوں اور انبیاء کی روحوں کو براہ راست دیکھتے ہیں۔ انکی باتیں سنتے ہیں اور ان سے علوم و معارف کا استفادہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں۔ انکے احوال میں ترقی ہوتی ہے۔ اور صور و امثال کے اس مشاہدہ سے آگے بڑھ کر ایسے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں۔ کہ جہاں کی کیفیات و تاثرات پر الفاظ و حروف کا جامہ ٹھیک نہیں بیٹھتا اور اگر کوئی جرأت کرکے اس حالت کی وضاحت کرنا بھی چاہے تو اخطار و لغزش کا سہارا

لئے بغیر چارہ نہیں۔ مختصراً یوں خیال کیجئے کہ یہ قرب و اتصال کی ایسی کیفیت ہے۔ کہ ایک گروہ تو اس کو حلول سے تعبیر کرتا ہے۔ ایک طائفہ اتحاد کہتا ہے اور ایک اسکو وصول کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ سب خیالات غلط ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب "المقصد الاسنیٰ" میں اس غلطی کی نشاندہی کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو شخص بھی اس حقیقت سے دوچار ہو۔ اسکو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہیئے:

وکان ما کان مما لست اذکرہ ۔۔۔ فظن خیراً و لاتسئل عن الخبر

جو ہوا سو ہوا۔ میں اسکی تفصیلات بیان کر سکتا نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اچھا ہی ہوا، زیادہ کاوش اور ٹٹول سے کیا فائدہ!

تصوف کی ضرورت: غرض یہ ہے کہ جس نے تصوف کی بہرہ مندیوں سے اپنا دامن طلب نہیں بھرا۔ اس نے حقیقتِ نبوت کی بو بھی نہیں سونگھی! اور بجز نام اور اسم کے اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔

اولیاء اللہ کی کرامات، انبیاء کی بدایات ہیں۔ چنانچہ کرامات کی یہ کیفیتیں آنحضرت کو اسی وقت میسر نہیں۔ جب آنحضرت غارِ حرا میں خلوت و عبادت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ اور اس حد تک ان میں والہانہ طور پر مصروف رہے کہ عربوں کو یہ دیکھ کر کہنا پڑا:

ان محمداً اعشق ربہ ۔ ۔۔۔ حضرت محمدؐ تو خدا پر عاشق ہو گئے ہیں۔

یہ وہ حالت ہے جس کو ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے، جو اس راہ پر گام فرسا ہے۔ اور جس کو یہ ذوق حاصل نہیں، وہ تجربہ اور سننے سے جان سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان لوگوں کے ساتھ کثرت سے نشست و برخاست رکھے۔ اور قرائن و احوال سے حق و یقین کو معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ یہ وہ گروہ پاک ہے کہ جو شخص بھی ان کے ساتھ محبت رکھے گا، حقیقت و ایمان کی نعمت سے محروم نہیں رہیگا۔ کیونکہ ان کا کوئی ہمنشین بھی اس معاملہ میں بے نصیب نہیں۔

جسے ذوق و شوق کی یہ دولت نہیں ملی۔ وہ بھی اس حالت یقین و اذعان کو دلیل و برہان کے شواہد کے ذریعہ معلوم کر سکتا ہے جیساکہ ہم نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں عجائب القلب کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

علم، ذوق اور ایمان: اگر کوئی شخص برہان و دلیل کی وساطت سے کسی نتیجہ تک پہنچتا ہے۔ تو یہ علم ہے، اگر ان نتائج سے روبرو دوچار ہے، تو یہ ذوق ہے اور اگر انہیں نتائج و معارف کو سننا اور تجربے سے دریافت کرتا ہے۔ تو اسے ایمان کہئے۔

یہ ہیں علم کے تین درجے، جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات ۔

اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنوں کے اور اہلِ علم کے درجات بڑھاتا رہتا ہے۔

ان کے ماسوا جو لوگ ہیں۔ وہ سراسر جاہل ہیں، اور یہی اس حالت و کیفیت کے منکر بھی ہیں۔ اور انھیں کو مذاق لعن و ٹھٹھوں کی سوجھتی ہے۔ یہی وہ حضرات ہیں جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم۔ ماذا قال انفاً اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبھم واتبعوا

اھواءھم - فاصمم واعمٰھم "

انہیں میں سے بعض ایسے بھی ہیں - جو تمہاری باتوں کو سنتے ہیں - یہاں تک کہ جب تمہاری بزم ارشاد سے نکل کر باہر جاتے ہیں - تو اہلِ علم سے کہتے ہیں - دیکھو اس نے آج کیا کہا - یہ وہی لوگ ہیں - جن کے دلوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہے، اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں سو اللہ نے انکو بہرہ اور اندھا بنا رکھا ہے -

صوفیاء کرام کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے اور ان کے طریق پر چلنے سے مجھ پر جو سب سے بڑی چیز منکشف ہوئی وہ نبوّت کی حقیقت اور اس کے خواص ہیں - چونکہ یہ جاننا بہت ضروری ہے - کہ نبوّت کا سرچشمہ علم کیا ہے - اس لئے آئندہ ابواب میں اس کی تفصیل سنیئے -

---

افکارِ غزالی

مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی - اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے - کہ "احیاء العلوم" کی مختصر مگر مستند تلخیص پیش کی جائے - جس میں غزالی کے تمام علمی و اصلاحی افکار کی جھلک موجود ہو - اس میں بتایا گیا ہے کہ علم اور اس کے حدود کیا ہیں؟ علماء حق یا طالبانِ آخرت اور علماءِ سوء یا شیفتگانِ رذائل دنیا میں کیا فرق ہے؟ زندگی کے فقہی انداز میں کیا قباحتیں ہیں؟ مناظرہ و جدل کیوں ناجائز ہے؟ ریا کیا ہے؟ اخلاص کس سے تعبیر ہے؟ اصلاحِ باطن کیوں ضروری ہے؟ ظاہر و معنی میں کیا ربط ہے؟ اور کہاں کہاں؟ ہم مجبور ہیں کہ الفاظ و ظواہر کے اقتضاء کو چھوڑ کر مغز و معنی اور روح و اصل کی طرف رجوع کریں - اسی ڈھنگ کی بیسیوں عارفانہ بحثیں ہیں جو اس کتاب کی وسعتوں میں سمٹ آئی ہیں - قیمت پانچ روپے -

افکارِ ابنِ خلدون مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی: اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو - کہ مقدمہ میں ابنِ خلدون نے اجتماعیات کے متعلق کن حکیمانہ افکار کو پیش کیا ہے - اور فلسفۂ تاریخ پر کیا روشنی ڈالی ہے تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے - اس میں عمرانیات پر سیر حاصل بحثیں ہیں - قومیں کیونکر معرضِ ظہور میں آتی ہیں؟ ان کی زندگی اور موت کن اسباب پر مبنی ہوتی ہے؟ خلافت کیا ہے؟ ملوکیت کیوں اُبھری؟ کیا کائنات کسی ارتقائی سلسلہ کا نام ہے؟ نبوّت کسے کہتے ہیں؟ تصوّف کے کیا حدود ہیں؟ اور علوم و فنون اور زندگی کے دوسرے ظہورات کی اجتماعیت میں کیا حیثیت ہے؟ اس انداز کے بیسیوں سوالات کا جواب آپ کو اس میں ملے گا - علاوہ ازیں اس میں ابن خلدون کے مفصل سوانح حیات بھی دیئے گئے ہیں - اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جن جن شکوک کو پھیلایا ہے ان کا بھی تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے - قیمت ساڑھے تین روپے -

ملنے کا پتہ

سکریٹری: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ - ۲ کلب روڈ - لاہور